جلیل عالی

میرا فکری و تخلیقی عمل

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ بنیادی سوال میرے اندر کلبلاتا رہتا ہے کہ مجھے ہونے کے اس عذاب میں کیوں ڈالا گیا ہے؟ ایک دھندلا دھندلا جواب ملتا ہے کہ یہ ایک امتحان ہے اس میں کامیابی دائمی نشاط و انبساط کا پروانہ ہوگی۔ وجودی کرب پھٹ پڑتا ہے۔'' میں نے اس امتحان میں بیٹھنے کی کب درخواست دی تھی! کیا یہ امتحان میرا آزاد انتخاب ہے! ہرگز نہیں!'' اس بنیادی سوال کے جواب کی تلاش اور اس ابتلا سے نجات کی کوشش مجھے اکثر معلوم و موجود سے آگے کے علاقوں میں سرگرداں کر دیتی ہے۔ اس سرگردانی کے دوران مجھے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور موجود و معلوم کو ایک ایسے جمالیاتی فاصلے سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ جس سے موضوع و معروض کی تفہیم کے کئی نئے گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ میرا یہ شعر کچھ ایسے ہی لمحات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نثار ان ساعتوں پہ صدیوں کے سحر عالی
جئے ہیں جن کے جلو میں شام و سحر سے آگے

میرے طرز فکر و احساس کی تشکیل کے اہم ترین مراحل کی انتہائی مختصر روداد یہ ہے کہ انٹر کی سطح پر منطق، نفسیات اور معاشیات کے مضامین سے میری سوچ میں بہتری پیدا ہوئی۔ گریجویشن کے درجے پر اخلاقیات و نفسیات اور اردو ادب کے مطالعے نے حسن و قبح اور خیر و شر کے حوالے سے فکری گہرائی عطا کی۔ اس مرحلے پر فلسفے کے استاد گرامی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے میری شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مجھے ایک صوفی مجاہد کے تصور سے آشنا کیا۔ ایم اے اردو کے زمانۂ طالب علمی میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید

سجاد باقر رضوی، خواجہ محمد زکریا اور سید معین الرحمٰن سے کسب فیض نے میرے ادبی ذوق کو نکھارا۔ اور ایم اے سوشیالوجی سے جہاں ادب کو سماجی و تہذیبی پس منظر میں سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی وہاں تجریدی فکریات اور معروضی اطلاق میں ایک توازن کی اہمیت کا شعور بھی حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال کے سنجیدہ مطالعے نے میری ڈانوں ڈول مذہبیت کو سہارا دیا۔ کلام اقبال سے نصب العینی سطح پر جینے کی تحریک ملی اور فکری اعتبار سے اس کے لیکچرز کا یہ جملہ میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا کہ خدا اور کائنات، روح اور مادہ لازم و ملزوم ہیں، کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، ایک کا استرداد دوسرے کو رد کرنے کے مترادف ہے۔

ہم چند دوستوں نے پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں ''نئے لوگ'' کے نام سے ایک ادبی، فکری انجمن بنا رکھی تھی، جس کے اجلاسوں میں شعبۂ فلسفہ کے طالب علم فہیم جوزی، محمد امین، اقبال آفاقی اور منظور اعجاز، شعبۂ نفسیات کے ہارون رشید اور شاہد محمود ندیم، شعبۂ انگریزی کے سجاد میر اور شعبۂ ابلاغیات کے امتیاز عالم کے علاوہ اس وقت کے معروف اشتراکی دانشور افتخار جالب اور عزیز الحق بڑی باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ترقی پسندی اور اشتراکیت سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ سوشیالوجی کا طالب علم ہونے کے ناتے مجھے نہ صرف مارکسزم کے باقاعدہ مطالعے کا موقع ملا بلکہ اپنے شعبے میں مارکسزم پر ایک سیمینار دینے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ مجھے یاد ہے یہ سیمینار میں نے شعبے کی روایت کے برعکس بطور چیلنج انگریزی کی بجائے اردو زبان میں دیا اور خلاف معمول سوال و جواب میں طلبہ کی بھرپور شرکت سے اس حقیقت کی توثیق کا موقع بھی ملا کہ اپنی قومی زبان کو وسیلۂ اظہار بنانے سے افہام و تفہیم میں کتنی سہولت رہتی ہے اور فکری عمل کے اصل تقاضے کس قدر پورے ہوتے ہیں۔

جہاں تک میرے اپنے فکری سفر کا تعلق ہے معاشی و معاشرتی حرکیات کی تفہیم کا بہت بہتر ذریعہ محسوس ہونے کے باوجود مارکسزم لینزم، اخلاقیاتی و روحانی سطح پر مجھے

Scanned by CamScanner

مطمئن نہ کر سکا۔ ابن عربی کے درجات حقیقت اور مراتب وجود کے تصورات سے تعارف حاصل ہوا تو ایک ایسا کلی ویژن مرا نصب العین بن گیا جو حقیقت کی مختلف جہتوں کے آپسی تضادات زائل کر کے ایک وحدت کا احساس ابھار سکے۔ شاید اسی لیے غزل میرے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کہ یہ اپنی صوری و معنوی ماہیئت کے اعتبار سے کثرت میں وحدت ہی کی آئینہ داری کرتی ہے۔

کس صورت ثبات پہ ٹھہری نگاہ دل
اک رقص رو میں ٹوٹتے بنتے چلے گئے

غالب کا یہ شعر

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
وا ماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

جس انسانی مجبوری کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کے مطابق ہمارے عقائد ایک لحاظ سے ہماری نفسی دفاعی میکانیت ہی کا نتیجہ دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ذاتی شکوک شبہات اور تحفظات کے امکان کے باوجود حقیقت اور وجود کی تمام سطحوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تشکیل پانے والا کثیر الجہات مابعد اطبیعاتی نظام فکر و احساس کسی بھی یک سطحی فکری نظام سے زیادہ جامعیت رکھتا ہے۔ اور ایسے کلی تصور حقیقت سے ابھرنے والے تصور انسان کا کم از کم مطالبہ یہ ہے کہ انسان کو نا انسان بنا کر رکھ دینے والی معاشی محرومی اور معاشی افراط، دونوں صورتوں سے نجات دلانے والے عمرانی معاہدے کے خدوخال ابھارے جائیں اور اس کے عملی نفاذ کا جتن کیا جائے۔ اس عظیم نصب العین کے اطلاقی و عملی پہلوؤں کے حوالے سے یہ پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ انفرادی روحانی و مابعد اطبیعاتی احساس و تجربہ کسی بڑی روحانی و مابعد اطبیعاتی روایت سے ہمرشتہ ہو کر ہی معاشرتی و تہذیبی جہات میں بامعنی اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ عالمی روحانی و مابعد اطبیعاتی روائتوں کے مطالعے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری روحانی و مابعد اطبیعاتی اور نفسی و

Scanned by CamScanner

تہذیبی دنیا اسلامی، فکری و تہذیبی روایت کی وسعتوں ہی میں زندہ و بیدار ہوتی ہے اور اسی سے میری قومی وابستگی، انسان دوستی اور آفاقیت کا تعین ہوتا ہے اور اسی کے بیکراں سرچشموں سے مجھے جبر و استحصال، ظلم و ناانصافی اور سامراجیت کی جملہ صورتوں کے خلاف جہاد و مزاحمت کی قوت اور حوصلہ ملتا ہے۔

ہمیں اس حکمت دوراں کا اک نکتہ بہت ہے
تمنا ہے الٹ دیں وقت کے داؤ تو آؤ

میرے باطن میں عقل و وجدان کی کشمکش جاری رہتی ہے لیکن مجھے ایسے عقلی نتائج زیادہ پرکشش محسوس ہوتے ہیں جنہیں میرے وجدان کی تائید حاصل ہو۔ بلکہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ میرے عقلی دلائل کسی وجدانی احساس کی تصدیق کے لیے ہی مرتب ہوئے ہیں۔ تاہم عقل سے آگے گزر جانے کے ارتقاعی تجربوں کے باوجود میں نفی عقل کا ہرگز قائل نہیں ہوں بلکہ میرے ہاں عقلی پیمانوں کے لحاظ کا یہ عالم ہے کہ بعض احباب مجھے اوور ریشنل قرار دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مگر میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں کہ مجھے کسی حد تک اقبال کی اس بصیرت اور سطح فکر و احساس شرکت کی اہلیت میسر ہے کہ:

من بندۂ آزاددم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

ایک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

اور خود اپنے ایک شعر کے مطابق میرا خیال یہ ہے کہ:

عشق خود سکھاتا ہے ساری حکمتیں عالی
نقدِ دل کسے دینا بارِ سر کہاں رکھنا

روحانی واردات کی طرح شعری تجربے کا بھی یہ وصف ہے کہ اس میں بڑے بڑے تضادات زائل ہو جاتے ہیں اور یہ ایسے فکر و احساس کے ابلاغ کی راہیں بھی نکال

لیتا ہے جنہیں عقلی و منطقی پیمانوں میں سمونا محال و ناممکن ہوتا ہے۔ تخلیقی واردات اپنے اندر حسن و جمال اور انکشاف و دریافت کے ایسے پہلو رکھتی ہے کہ بیشتر بے معنی دکھنے والے احوال حیات ایک پر کیف معنویت سے ہمکنار ہونے لگتے ہیں اور زندگی کرنے کا ولولہ تازہ ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے تخلیقی وقفوں کے بنجر شب و روز مجھے شدید کرب سے دوچار کیے رکھتے ہیں۔

جب بھی موسم ہنر حرف و بیاں لے جائے
یوں لگے جسم سے جیسے کوئی جاں لے جائے

میرا زواں رُواں بڑی بے چینی سے ان وقفوں کے خاتمے اور تخلیقی لمحات کی آمد کا انتظار کرتا ہے:

ترستا ہے دل شاعر
کہیں کوئی سخی ساعت
یہی دو چار
خوش تعبیر حرفوں کا کرم کر دے
تو کچھ دن زندگی کرنے کا
پھر سے آسرا ہو جائے (احتیاج)

چنانچہ جب کبھی مطلوبہ ساعتیں نصیب ہوتی ہیں تو پورا وجود ایک عجیب معنوی سرشاری میں نہا جاتا ہے۔

جب بھی بادل بارش لائے شوق جزیروں سے
خوشہ خوشہ حرف کی بیلیں بھر گئیں ہیروں سے

تخلیقی عمل ایک نہایت پیچیدہ اور پر اسرار عمل ہے۔ یہ نہ صرف مختلف تخلیق کاروں کے ہاں مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات ایک ہی تخلیق کار کے مختلف تخلیقی تجربوں میں مختلف انداز سے کارفرما ہوتا ہے۔ تاہم بہت سی متنوع کیفیات کے

Scanned by CamScanner

باوجود زندگی میں بار بار تخلیقی مراحل سے گزرنے کی بنا پر ایک تخلیق کار کسی حد تک اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں کچھ واضح اور کچھ دھندلے اشارے کر سکے۔ یہاں میرے پہلے شعری مجموعے کے آغاز میں درج میری نظم '' ا ب ج د '' کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔ اس میں میرے تخلیقی لمحات کی چند کیفیات یوں نمایاں ہوئی ہیں۔

جیسے فضا میں
کبھی کبھی آوارہ بادل
بامعنی تصویر کی حیرت بن جاتے ہیں
جیسے درختوں کی شاخوں پر
کبھی کبھی سرمست ہواؤں کے جھونکوں سے
پتوں کی آوازیں
ہم آہنگ سروں میں ڈھل جاتی ہیں
جیسے کوئی ننھا سا بچہ
پہلی بار اچانک ایک دن
ٹوٹے پھوٹے لفظ ملا کر
پوری بات بنا لیتا ہے

میں زیادہ تر غزل کہتا ہوں۔ تخلیقی عمل کے حوالے سے میرے احساسات کا ادھورا سا خاکہ یہ ہے کہ کسی تازہ غزل کے آغاز سے چند روز پیشتر ہی مجھ پر کچھ مختلف سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں ایک انوکھے اکسائٹمنٹ، ایک عجیب سی بے چینی سے گزرنے لگتا ہوں۔ اس دوران اچانک غزل کی کوئی زمین کسی ابتدائی مصرعے کی صورت سامنے آجاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تخلیقی واردات کی دریافت کے لیے بنیادی کلید ہاتھ آگئی ہو۔ ساری سائیکی اس زمین کے آہنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ مصرعہ یوں احساس دلاتا ہے جیسے سطح سمندر پر کوئی آتش برگ تیرتا ہوا دکھائی دیا ہو جس کا زیر آب 9/10

مصرعہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ مجھے فکر و احساس اور معانی و تاثر کی ایک پر اسرار اور پُر عجائب دنیا میں لے جاتا ہے۔

طرح طرح کی تمثالوں، عکسوں اور ہیولوں کا ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ ان تمثالوں، عکسوں اور ہیولوں کو گرفت میں لینے کے بہت جتن کرتا ہوں مگر الفاظ بے مایہ و لاچار دکھائی دیتے ہیں۔ پھر دوسرے مصرعے کی آمد یا تکمیل سے احساس ہوتا ہے جیسے تخلیقی واردات کے کسی ایک پہلو کی ذرا سی جھلک دکھائی دے گئی ہو۔ اگرچہ مناسب الفاظ کی عدم دستیابی کا احساس بدستور موجود رہتا ہے تاہم مناسب الفاظ کی تلاش کو ملتوی کر کے میں واردات کے دوسرے گوشوں کی دریافت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ کبھی کبھار پورے کا پورا مصرعہ یا پورے کا پورا شعر ایسے موزوں الفاظ کے ساتھ آپ سے آپ سامنے آجاتا ہے کہ اس سے زیادہ موزوں الفاظ تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ پانچ سات اشعار کے بعد جب تیرت و استعجاب کی شدت ماند پڑنے لگتی ہے تو مزید اشعار کہنے کی کوشش ترک کر دیتا ہوں اور ہو چکے اشعار کی تراش خراش میں لگ جاتا ہوں۔ تراش خراش کے عمل میں بھی یہی بات اہمیت رکھتی ہے کہ شعری واردات کی نزاکت، لطافت اور وقار سے پوری طرح ہم آہنگ پیرایۂ اظہار تک رسائی حاصل ہو۔ اس ضمن میں قطعی اطمینان تو کبھی بھی حاصل نہیں ہو پاتا پھر بھی یہ طمانت محسوس ہوتی ہے کہ پانچ سات اشعار نے مل کر اس پر اسرار واردات کے کچھ نہ کچھ نقوش تو ابھار ہی دیے ہیں جس نے پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

عالی طلوع فن کی نشانی یہی تو ہے
لفظوں میں ان کہی کا اثر جاگنے لگے

تخلیق ہونے والی ہر غزل نشاط یافت کے ساتھ ساتھ ایک ملال نایافت اور ایک گہرا احساس نارسائی بھی دے جاتی ہے۔ اور یہ حسرت ہوتی ہے کہ فکر و احساس اور معانی کے جن پر اسرار علاقوں سے گزر ہوا کاش ان کے کچھ اور

Scanned by CamScanner

نشانات بھی محفوظ ہو سکتے۔

ابھر ابھر کر ہزار لہروں مثال آئے
مگر کہاں اوجِ شعر تک سب خیال آئے

اس سارے تخلیقی سفر کا دورانیہ کم سے کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے پر محیط ہوتا ہے۔ میں نے اپنی نظموں کی بنت کے عمل بارے زیادہ غور نہیں کیا مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بنیادی طور پر وہ بھی تخلیقی بے چینی ہی کی دین ہیں اور کسی نہ کسی طور میری مرکزی تخلیقی واردات ہی سے ہمرشتہ ہیں۔ میں زبردستی شعر کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے دوسرے شعراء کی بھی ایسی ہی شاعری اچھی لگتی ہے جو فنی دسترس اور استادانہ مہارت کے شعوری مظاہرے کی بجائے حقیقی تخلیقی واردات کا فطری ثمر ہو۔ یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنی تخلیقی ذات کی دریافت میں میر تقی میر، غالب، اقبال، راشد، مجید امجد، فیض، ندیم اور منیر نیازی کے مطالعے نے بڑی مدد دی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنے شاعرانہ وجود کے بکھرے ہوئے ریزوں کو بیشتر انہی کے ہاں سے اکٹھا کیا ہے۔ تخلیقی تحریک کے ان خصوصی حوالوں سے قطع نظر مجھے سبھی جینوئن فنکار بھلے لگتے ہیں۔ میں اپنے تمام ہمعصر تخلیق کاروں کو اپنی ترجیحی برادری تصور کرتا ہوں۔ اپنی باطنی و روحانی صحت کے خیال سے میں دوسروں کے فکری و تخلیقی جوہر کا بہت جلد اعتراف کر لیتا ہوں۔ البتہ ادبی جعلسازی سے مفاہمت نہیں کر سکتا کیونکہ میں انسانی تذلیل کی ہر صورت سے دکھی ہوتا اور اسے رد کرتا ہوں۔ ایسے تخلیق کار جو فکری و نظریاتی اور اخلاقی حوالوں سے اپنی مرکزی تخلیقی واردات سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتے ہیں مجھے اور بھی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

مجھے انسانی بلند کرداری بہت انسپائر کرتی ہے۔ مجرد افکار و نظریات کی اپنی قدر و قیمت کے باوجود میرے نزدیک معاشرے کی حقیقی تعمیر و تہذیب میں انسانی کردار و عمل ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اپنے فکر و نظر اور آدرش سے ہم آہنگ زندگی کرنے والے

Scanned by CamScanner

لوگوں کو میں لائق صد احترام سمجھتا ہوں۔ میرے خیالات اور زاویۂ نگاہ کے بالکل برعکس نظریات رکھنے والے افراد کی بھی یہ خوبی میری نظروں میں ان کا مقام بہت بلند کر دیتی ہے۔ تجزیہ و غور و فکر کرنے والے سچے لوگوں کا ایک ہی جیسے نتائج پر پہنچنا لازمی نہیں ہوتا۔ اپنے اپنے انداز نظر سے حیات و کائنات کی مختلف تعبیر اور تصور انسان کی مختلف تشکیل تک رسائی ایک فطری امر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کوئی اپنے طرز فکر و احساس اور نصب العین سے کتنا مخلص ہے۔ مختلف افکار و تصورات کی موجودگی میں فکری و تہذیبی عمل کی بہتر پیش رفت کے لیے تحفظات کے بغیر پر خلوص مکالمہ ہی ایک روشن راستہ ہے۔ اس لیے مکالمے کا تعطل میرے لیے تخلیقی وقفے کے کرب سے کسی طور کم اندوناک نہیں ہوتا۔ مکالمہ چاہے گفتگو کے توسط سے ہو چاہے تخلیق کے وسیلے سے وہ دوسروں کو اپنے زاویۂ نگاہ سے منظر بینی کی دعوت ہی تو دیتا ہے۔ سو یہ کہنا میری مجبوری بھی ہے اور حق بھی کہ:

ہے منظر وہی

پر

جہاں سے اسے

میں نے دیکھا ہے

تم بھی

وہاں پر کھڑے ہو کے دیکھو

تو کچھ ایسے اسرار کھلنے لگیں گے

کہ شاید تمہیں

سارے منظر کے بارے میں

پہلا تاثر بدلنا پڑے

(زاویہ)

Scanned by CamScanner